تفسیر القرآن کے محاسن اور نقائص کا تحقیقی مطالعہ

*ہادی بخش

**شہزاد چنا

ABSTRACT

This article aims to understand and elaborate the key features of theexegesis "Tafsirul-Qur`an" written by Sir Sayyid Ahmad Khan (1817–1898), an Indian Muslim pragmatist, Islamic reformist and philosopher of nineteenth century British India. The quranicinterpretation"Tafsirul-Qur`an"of Khan, discusses the important characteristics of Islam based on rational, reasoning, and inference grounds. The tafsir elaborates the motives and reasons behind the creation, emergence, and acceptance of erroneous and misleading ideologies found in the human societies."Tafsirul-Qur`an" especially identifies the weakness of the prevailing religious ideologies, and invites the "People of the Book" Ahle-Kitab, to accept the religion "Islam"after making a thoughtful, unbiased and logical comparison with the features of other religious ideologies.Khan has also addressed the disseminated misinformation and objections raised by the Orientalists about Islam, and has replied in a rationalistic and logical approach and manner. "Tafsirul-Qur`an" does not indulge in the linguistic and juristic (fiqhi) issues of the Qur'an, but strongly calls to be practical Muslims, and consider Qur'an as book of guidance.

Keywords: Sir Sayyid Ahmad Khan, Tafsirul-Qur`an, rational, People of the Book, Ahle-Kitab, Muslims, Qur'an.

تمہید

ہر تفسیر کی خصوصیات مختلف ہوتی ہیں۔ہر تفسیر لکھنے والے مفسر پر اس کا نظریہ حیات،ماحول، تعلیم و تربیت،عبادت، معاشرت،سیاست و تمدن اور مرکزی خیال یا ترجیح کے قابل کسی نکتہ کا کردار اہم ہوتا ہے۔مذکورہ چیزیں تفسیر لکھتے وقت اپنا اثر ظاہر کرتی ہیں۔اسی وجہ سے ہر تفسیر دوسری تفاسیر سے منفرد نظر آتی ہے۔اگرچہ تمام تفاسیر میں بعض مشترکات بھی پائے جاتے ہیں۔لیکن اکثر میں بہت سارے پہلوؤں کا تذکرہ منفرد ہوتا ہے۔ہم نے تفسیر القرآن کا انتخاب کیا ہے۔تاکہ اس کے مؤلف سر سید احمد خان کے نمایاں محاسن اور نقائص کو منظر عام پر لائیں اور اپنی زندگی میں ان سے استفادہ کرنے کا موقع آسانی سے حاصل ہو جائے۔ہم نے محاسن اور نقائص کو اختصار کے

* پی ایچ ڈی اسکالر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، اسلام آباد برقی پتا: hadibukhsh@gmail.com

** اسسٹنٹ پروفیسر، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد برقی پتا: shahzadchanna@yahoo.com

ساتھ بیان کیا ہے۔

ا۔ تفسیر القرآن کے محاسن کا بیان

اہل کتاب سے متعلق قرآنی آیات کی تفسیر میں تفسیر القرآن کے محاسن اور ایجابی نکات درج ذیل ہیں:

ا۔ سرسید بنیادی طور پر ایک ادیب اور عبقری شخصیت کے حامل تھے۔ اس لیے آپ نے اپنی تفسیر میں استنباط کے ذریعے اہم نکات ذکر کیے ہیں۔(۱)

۲۔ آپ نے فاسد عقائد اور نظریات کے پیدا ہونے کے اسباب اور وجوہات پر بھی گفتگو کی ہے۔ تاکہ ان موجودہ فاسد نظریات سے اہل کتاب رجوع کریں اور دین اسلام کو قبول کریں۔(۲)

۳۔ اس تفسیر میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیش گوئی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ تاکہ اہل کتاب میں سے معتدل افراد کے سامنے آنحضرت ﷺ کے متعلق نبوت کی دعوت کو سامنے رکھا جائے کہ وہ اسے قبول کریں۔(۳)

۴۔ اسمیں قرآن فہمی کے لیے عبارت کو سہل بنایا گیا ہے اور کہیں اگر کوئی چیز سمجھنے میں دشوار نظر آئی تو اس جگہ پر مولف نے خود سوال تیار کیا ہے اور اس کا جواب تسلی بخش دینے کی کوشش کی ہے۔(۴)

۵۔ اس تفسیر میں بعض مقامات پر امہات تفاسیر کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور اپنے موقف کو موثر کرنے کی غرض سے ان تفاسیر سے استدلال بھی کرتے ہیں۔(۵)

۶۔ آپ نے اپنی تفسیر میں تفسیر موضوعی کا بھی اہتمام کیا ہے یعنی ایک ہی موضوع سے متعلق تمام آیات کو جمع کرکے تفسیر بیان کی ہے۔ البتہ تفسیر موضوعی کا اہتمام کم ہی پایا جاتا ہے۔(۶)

۷۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں مختلف مقامات پر قرآن پاک کے بیان کی تصدیق کتب مقدسہ کے ذریعے سے بیان کی ہے۔(۷)

۸۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں مستشرقین کے شبہات اور اعتراضات پر مدلل بحث کرتے ہوئے حق کو ثابت کیا ہے۔(۸)

۹۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں لغوی اور فروعی مباحث سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے تفسیر میں قرآن پاک کے ھدایت والے پہلو کی طرف توجہ مرکوز کی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ قرآن پاک سے عملی زندگی سے وابستہ مسائل میں رہنمائی حاصل کی جائے۔(۹)

۱۰۔ سرسید اپنے زمانے کے احوال سے باخبر رہتے تھے اس لیے آپ نے اپنی تفسیر میں قرآنی آیات کے مفہوم کو موجودہ حالات پر تطبیق کرنے کی اچھے انداز میں کوشش کی۔(۱۰)

۲۔ تفسیر القرآن کے نقائص کا بیان

دنیا میں کمال صرف اللہ تعالی کی ذات کو حاصل ہے جو کہ کسی نقص اور عیب سے پاک ہے۔ اہل سنت و جماعت کے متفقہ عقیدے کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے صرف عصمت ہے یعنی وہ گناہوں سے پاک ہیں۔ باقی ان کے علاوہ تمام انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہر کسی کا کلام قبول کیا جاسکتا ہے اور رد بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تمام انسان غلطی سے پاک نہیں ہو سکتے۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ.(۱۱)

(تمام انسان غلطی کرنے والے ہیں مگر اچھے غلطی کرنے والے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہوں)

اسی طرح انسانوں کی کتابیں بھی نقص اور عیب سے پاک نہیں کیونکہ ان میں بھی خطا اور غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تفسیر سرسید میں بہت ساری خوبیوں کے باوجود چند ایک لغزشوں اور غلطیوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا مقصود ہے۔ مگر سرسید کی یہ چند ایک غلطیاں ان کی تفسیر میں قدر و منزلت میں کمی نہیں کر سکتی۔ تفسیر سرسید میں بعض امور ایسے ہیں جن میں مولف نے جمہور علماء مسلمین سے اختلاف کیا ہے۔ لہٰذا ان اسباب کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ پُر فتن دور میں ہر طرف شیطان کی چالیں نظر آتی ہیں۔ ان چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ کا مفہوم اپنے موقف کی تائید میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اور صحیح معانی سے رو گردانی اور تاویل کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ اپنے موقف اور نظریہ کو دھوکہ اور فریب کے ذریعے امت میں پھیلائیں۔ اگرچہ سر سید جیسے ہمدرد اور خیر خواہ انسان پر دھوکہ دہی کا الزام لگانا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ البتہ ہمارا مقصد یہ ضرور ہے کہ ملت اسلامیہ کو ان اسباب کی طرف توجہ دلائیں تاکہ وہ سرسید کی طرح نہ پھسل جائیں کہ امت اسلامیہ کے متفقہ امور میں جمہور علماء مسلمین سے اختلاف کرنے لگ جائیں۔ جس طرح سرسید نے اختلاف کیا ہے۔ کیونکہ ایک محقق کی ذمہ داری ہے کہ ان اسباب کو تلاش کرے جن کی وجہ سے قرآن پاک کے صحیح موقف کے بجائے دوسرے نظریات کی طرف جانے کا اندیشہ نظر آتا ہو۔ وہ اسباب جن کی وجہ سے سرسید نے جمہور علماء مسلمین سے اپنی تفسیر میں اختلاف کیا۔ ان کا تذکرہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

ا: جدید سائنس کے علوم سے مرعوبیت

اٹھارویں اور انیسویں صدی، جدید سائنس کے ظہور کی صدیاں تھیں۔ نئی سائنسی دریافتوں کے آجانے سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اب مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بلکہ سائنس نے کائنات کے اسرار فاش کر دیے ہیں۔ اور یہی دور سرسید کا تھا جس سے وہ متاثر ہوئے، انہوں نے اس اصول کے تحت قرآن حکیم کی تفسیر

کرکے دنیا کو یہ باور کرانا چاہا کہ قرآن (جو مذہب اسلام کی بنیاد ہے) اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ وہ اپنے وضع کردہ اس اصول سے غیر مسلموں کے سامنے قرآن کا اعجاز واضح کرکے انہیں قرآن کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔[۱۲]

سائنسی علوم اور انکشافات میں تبدیلی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے ان پر کُلی طور پر بھروسہ کرنا محال ہے۔[۱۳] مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے سائنس کو حتمی سمجھا اور اس علم سے مرعوب ہوگئے۔ علوم جدیدہ کے دلائل صرف قیاسی اور فرضی ہی نہیں رہے، بلکہ تجربہ اور عمل نے ان کو درجہ مشاہدہ تک پہنچادیا ہے۔[۱۴] آپ نے سائنس پر حد سے زیادہ بھروسہ کیا تھا۔ آپ کے نزدیک اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے جو عقل اور سائنس کے خلاف ہو یا کسی بھی مہذب وترقی یافتہ معاشرے میں ناقابل عمل ہو جائے۔ اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور رسالہ تہذیب الاخلاق بھی جاری کیا۔ تاکہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ اسلام اور سائنس ایک دوسرے کے منافی نہیں۔[۱۵] سرسید احمد خان سائنسی علوم پر زیادہ یقین اس لیے رکھتے تھے کہ کہیں اسلام کے مختلف امور کو ناقابل عمل نہ بنایا جائے۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ اسلام کو سائنس کے موافق بنایا جائے۔ چنانچہ اس چیز کا اظہار آپ نے یوں فرمایا: ''اس دور میں جدید علم الکلام کی ضرورت ہے جس سے یا تو علوم جدیدہ کو باطل ثابت کیا جائے، یا انہیں اسلام کے مطابق کیا جائے''[۱۶]۔ اسی وجہ سے سرسید نے قرآن پاک میں جس جگہ سائنس اور قرآن کے درمیان میں اختلاف پایا وہاں پر آیت کی تاویل کرنے لگے۔ اور کوشش کی کہ آیت کے مفہوم کو سائنس کے مطابق بنا دیا جائے۔[۱۷] بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید سے تفسیر کے میدان میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اسی بات کا اظہار آپ کے مداح اور سوانح نگار الطاف حسین حالی مرحوم نے کیا ہے۔۔۔ سرسید احمد خان نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر ان سے رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔[۱۸]

۲: نظریہ فطرت کی طرف رغبت

سرسید کے نزدیک کلمات اللہ اور خلق اللہ دو مترادف اور یکساں الفاظ ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سرسید اپنے موقف کی تائید میں قرآن پاک کی بعض آیات بھی ذکر کرتے ہیں۔[۱۹]

آپ فرماتے ہیں کہ ورڈ آف گاڈ اور ورک آف گاڈ (Work of God اور Word of God) دونوں کا متحد ہونا لازم ہے۔ اگر ورڈ، ورک کے کسی حیثیت سے مطابق نہیں ہے تو ایسا ورڈ، ورڈ آف گاڈ نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ عبارت میں سرسید نے قرآن پاک کو ورڈ آف گاڈ اور کائنات کے نظام کو ورک آف گاڈ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ دونوں کا آپس میں مطابق ہونا لازم ہے۔ یعنی موجودات عالم کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ مطابق واقعہ ہے۔ خدا کا قول (Word of God) اس کے فعل (Work of God) کے خلاف نہیں ہوتا۔ لہٰذا

قرآن مجید خدا کا قول (Word of God) ہے اور مخلوقات خدا کا فعل (Work of God) ہیں۔[۲۰] مزید آپ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو آگ کا کام ہے جلانا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نہ جلائے۔ چونکہ یہ واقعہ قانون فطرت کے خلاف ہے اس لیے غلط قرار دیا جائے گا۔ (معجزہ اُسے کہتے ہیں جو قوانینِ کائنات کے خلاف وجود میں آئے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت اور اصحابِ کہف کی طویل نیند' مجلّہ میں مختلف نقطۂ ہائے نظر کو شائع کیا جاتا ہے جن سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مدیر) بلکہ یہاں پر وہ معنی مراد لیے جائیں گے جو کہ فطرت کے موافق ہوں۔[۲۱] آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ خارجی کائنات اور اس کے قوانین اللہ تعالی کی صنعت اور اس کا فعل ہیں۔ اور قرآن اس کا قول ہے۔ اس لیے اللہ تعالی کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا اور نہ ہے۔[۲۲]

سرسید فطرت، نیچر کو حقائق و موجودات یا اصول نظام کائنات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ سارے عالم میں واقعات ایک نظم اور ضابطے سے رونما ہو رہے ہیں۔ ہر چیز مقررہ قوانین پر عمل کر رہی ہے اور ان کے مطابق اس کے خواص اور افعال کا ظہور ہوتا ہے۔ جیسے آگ جلا رہی ہے اور جلانے پر مجبور ہے۔ یہ ایک ضابطے اور قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسی قانون، ضابطے اور اصول کا نام فطرت اور نیچر ہے۔[۲۳] سرسید کے نظریہ فطرت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ایک محدود اختیار کے مالک ہیں، جو کائنات کو بنا کر خود بے تعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ سرسید نے قرآن پاک میں مذکورہ معجزات کو دیکھا تو نظریہ فطرت کے خلاف سمجھتے ہوئے، ان معجزات کے متعلق آیات میں الفاظ کی تاویل کرنے لگے۔[۲۴]

۳: مغربی اثرات کی تاثیر

وہ امور جن کی وجہ سے سرسید احمد کی فکر میں تبدیلی آئی ان میں سے مغربی اثرات بھی قابل ذکر ہیں۔ سرسید نے مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا تھا۔ آپ کچھ عرصہ انگلستان میں مقیم رہے اور مغربی ترقی سے مرعوب ہو گئے۔ سرسید جب انگلستان گئے تو افکار و خیالات میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ کچھ نظریات کو من و عن قبول کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے انکے اثرات کو قبول کیا جیسے انگلستان کے جدید افکار و خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔[۲۵]

یہی وجہ ہے کہ مغربی اثرات کی تاثیر کے بدولت آپ نے وہاں پر موجود نظریہ فطرت کو اختیار کیا۔

۴: معتزلی فکر سے وابستگی

اگرچہ سرسید نے کبھی معتزلی ہونے کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی ان سے وابستگی ظاہر کی۔ مگر آپ کے نظریات سے عام طور یہ سمجھا جانے لگا کہ آپ معتزلی فکر سے قریب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ آپ نے معتزلہ کی طرح عقل کو نقل پر زیادہ

اہمیت دی۔ یہی نظریہ معتزلی فکر کی بنیاد ہے۔ اسلام کے مختلف امور کو سمجھنے میں جب عقل ہی کو معیار کا درجہ دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سرسید نے ان تمام آیات کی تاویل کی جن میں صریحاً انبیائے کرام کے معجزوں کا ذکر ہے۔[۲۶]

۵: کتب مقدسہ پر زیادہ اعتماد

سرسید کی فکر پر اثر انداز ہونے والی چیزوں میں کتب مقدسہ پر زیادہ اعتماد کرنا بھی شامل ہے۔ حالانکہ اہل کتاب کی کتب مقدسہ سے استفادہ ایک حد تک کیا جاسکتا ہے۔۔۔ عہد صحابہ کرام میں تفسیر کے مصادر میں سے اہل کتاب بھی ایک مصدر تھا۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ کرام ہر چیز اہل کتاب سے پوچھتے تھے۔ اور نہ ہی ہر چیز صحابہ کرام اہل کتاب کی قبول کرتے تھے۔ مگر صرف یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام اہل کتاب سے وہ چیزیں پوچھتے تھے جن کا بیان قرآن پاک میں مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی چیز میں سچ اور جھوٹ کا احتمال ہوتا تو صحابہ کرام اس پر اپنی طرف سے کوئی حکم صادر نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: لا تصدقوا اہل الکتاب ولا تکذبوھم و قولوا: (اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا۔۔۔)[۲۷] اسی طرح صحابہ کرام یہود کی اس بات میں تصدیق نہیں کرتے تھے، جو کہ اسلامی عقیدہ یا اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔ صحابہ کرام اہل کتاب سے متعلق امور میں صرف جواز کے دائرے میں مقید تھے۔ یعنی جواز کی حد تک استفادہ کرتے تھے۔ پھر اسی حد تک بیان کرتے تھے۔ جو کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات سے سیکھا تھا۔۔۔[۲۷] مگر سرسید نے کتب مقدسہ پر اس حد سے زیادہ اعتماد کیا۔ جیسے آپ نے حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ باپ کے بغیر پیدا نہیں ہوئے۔ اس موقف کو اختیار کرنے پر آپ نے کتب مقدسہ کو بنیاد بنایا اور انہی کتابوں سے استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ جمہور علماء مسلمین کے ہاں یہ مسئلہ متفقہ تھا کہ حضرت عیسی علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن سرسید احمد خان نے کتب مقدسہ پر زیادہ اعتماد کرکے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے والد موجود تھے۔

۶: قرآن کے مصادر کی طرف عدم توجہ

سرسید کی فکر پر جن اسباب نے زیادہ اثر ڈالا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے قرآن پاک کے مصادر[۲۸] کی طرف توجہ نہیں دی۔ حالانکہ تمام مفسرین نے قرآنی آیات کی تفسیر کرنے میں سب سے پہلے قرآن بعد میں احادیث، اقوال صحابہ، اقوال تابعین اور عربی لغت کی طرف توجہ دی۔ تاکہ قرآن کی تفسیر میں غلطی کا امکان کم ہو۔ کیونکہ ان بالا مذکورہ مصادر کی طرف نہ دیکھنے کا نتیجہ گمراہی کا سبب ہو سکتا ہے۔۔۔ اہل اسلام کے نزدیک یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مذکورہ مصادر کی پیروی نہ کی گئی اور قرآن پاک کی تفسیر صرف اپنی فکر ہی کے ذریعے کی جائے۔ اور من مانی تاویلات کا نشانہ بنایا جائے تو پھر یہ کتاب ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بنے گی۔[۲۹]

مگر سرسید نے ان مذکورہ بالا مصادر کی طرف توجہ کیے بغیر قرآن پاک کی تفسیر کی۔ جس کی وجہ سے تفسیر میں بہت سے مقامات پر آپ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اگرچہ بعض مقامات پر آیات کی تفسیر قرآن، احادیث، اقوال صحابہ، اقوال تابعین اور عربی لغت سے بھی استدلال کرتے ہیں مگر اس حد تک ان مصادر سے استفادہ کرتے ہیں کہ اپنے موقف کو مضبوط کریں اور ان مصادر کی وجہ سے استدلال کر سکیں۔ آپ کا طریقہ قرآنی آیات کی تفسیر کرنے کا یہ تھا کہ غور و فکر کے بعد آیات کی تفسیر بیان کرتے تھے۔[۳۰] یہ مذکورہ اسباب تھے جن کی وجہ سے سرسید کی فکر میں تبدیلی رونما ہوئی اور آپ نے اپنی تفسیر میں جمہور علماء مسلمین سے اختلاف کیا۔ سرسید نے جن امور میں جمہور علماء مسلمین سے اختلاف کیا۔ ان امور میں سے کچھ کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ درج ذیل ہے:

اول۔ قرآن میں مذکورہ انبیاء بنی اسرائیل کے معجزات کی تاویل

جیسے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون۔۔۔ تمام مفسرین حضرت موسی علیہ السلام کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے ہیں جو خلاف قانون قدرت واقع ہوا ہو، جس کو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسی علیہ السلام نے سمندر پر لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا۔ اور پانی مثل دیوار یا پہاڑ کے ادھر اُدھر کھڑا ہو گیا، اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا، اور حضرت موسی علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار اُتر گئے، فرعون بھی اسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب ڈوب گئے، اگر در حقیقت یہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا، تو خدا تعالیٰ سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اس پر چلے جاتے، خشک رستہ نکالنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو مطابق قانون قدرت واقع ہوا تھا، جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا۔۔۔[۳۱] اسی واقعہ کو دوسری جگہ سرسید نے آیت میں موجودہ الفاظ کی تاویل کر کے اسے جوار بھاٹے کا سبب قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے، جس کا پانی بسبب جوار بھاٹے (سمندر کا اتار چڑھاؤ جو چاند کی کشش کی وجہ سے ہوتا ہے) کے اُترتا چڑھتا رہتا تھا، تو اسپر پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح (پھیلا ہوا) بیابان ہے، وہاں اکثر ریگ (ریت) کا طوفان رہتا ہے، جو اس ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور حال کے سیاحوں نے بھی اس کو دیکھا ہے۔[۳۲] حالانکہ واقعہ عبور بحر کو جمہور علماء مسلمین نے معجزہ قرار دیا ہے اور تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے۔ کیونکہ قرآن پاک کے الفاظ اس بیان میں صریح ہیں۔ مگر آپ نے الفاظ کی تاویل کر کے قانون قدرت کے موجب اسے بناتے ہوئے جوار بھاٹے کا سبب قرار دیا ہے۔ بعض مفسرین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو معجزہ قرار دیا ہے۔ وہ مفسرین درج ذیل ہیں:

الف۔ امام الرازی:[۳۳]۔۔۔ سمندر میں بارہ پہاڑ نما راستے بن گئے اور ہر ایک میں ایک رستہ بن گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی لاٹھی کو سمندر پر مارا تو اس میں راستے بن گئے۔ پس جب فرعون سمندر میں داخل ہوا تو حضرت میکائیل نے آواز لگائی کہ فرعون کے لشکر کے پہلے بندے سے لے کر آخری فرد تک کے لوگوں کو گھیر اڈالا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم کیا کہ ان پر چلنا شروع ہو جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے فرعون کے پیروکاروں کو غرق کیا اور اس وقت تم دیکھ رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس بہت بڑی نعمت کو خاص کیا ہے اور ایک واضح معجزہ بنایا۔[۳۴]

ب۔ امام قرطبی:[۳۵]۔۔۔ جب فرعون اور اس کے ساتھیوں نے سمندر پار کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے پانی میں انہیں غرق کیا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی طرف وحی کی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے علیحدہ ہو جائے۔[۳۶]

ج۔ ابن کثیر:[۳۷]۔۔۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو فرعون نے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ سمندر میں پہنچ گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کا پانی ان پر پلٹ دیا۔ اس لیے قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے فرعون کے پیروکاروں کو غرق کیا اور اس وقت تم انہیں دیکھ رہے تھے۔[۳۸]

د۔ امام شوکانی:[۳۹] امام شوکانی حضرت قتادہ کا قول ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قسم اُٹھا کر فرمایا کہ سمندر کو توڑا گیا یہاں تک ایک خشک رستہ بن گیا جس پر وہ (بنی اسرائیل) چلے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دی۔ فرعون اور بنی اسرائیل کے دشمنوں کو غرق کیا گیا۔ مذکورہ مختلف تفاسیر سے معلوم ہوا ہے کہ واقعہ عبور بحر ایک معجزہ ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ظہور فرمایا۔ تاکہ اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی جائے اور حق کو غالب کیا جائے۔[۴۰]

دوم۔ سرسید کا ملائکہ کے بارے میں تصور

آپ کے نزدیک ملائکہ کا علیحدہ وجود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ قویٰ ہیں۔۔۔ ان باریک باتوں پر غور کرنے سے اور اس بات کے سمجھنے سے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے جاہ وجلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا، بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں۔ ملک یا ملائکہ کہا ہے، جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے، پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوت نمو، برق کی قوت جذب و دفع، غرضکہ تمام قویٰ جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں، وہی ملائک و ملائکہ ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، انسان ایک مجموعہ قویٰ ملکوتی اور قویٰ بہیمی کا ہے، اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں، جو ہر

ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں، اور وہی انسان کے فرشتے اور ان کی ذریات، اور وہی انسان کے شیطان اور اس کی ذریات ہیں۔۔۔ اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں جیسے کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا؟ کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کرسکتے، بلکہ اس کے حکم کو بجالاتے ہیں۔[۴۱] ۔۔۔ فرشتوں کی نسبت بھی جو بحث ہے وہ نہایت ہی غور طلب ہے، قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر آیا ہے، اور اس لیے ہر ایک مسلمان کو جو قرآن پر یقین رکھتا ہے فرشتوں کے موجود اور ان کے مخلوق ہونے پر یقین کرنا ضرور ہے، مگر جہاں تک بحث ہے اس پر بحث ہے کہ وہ کیسی مخلوق ہے۔ عام خیال مسلمانوں کا اور علمائے اسلام کا یہ ہے کہ جس طرح انسان و حیوان جسم و صورت و شکل رکھتے ہیں، اسی طرح وہ بھی جسم اور صورت و شکل رکھتے ہیں، اور ان کے پر بھی ہیں جن سے وہ اُڑ کر آسمان پر جاتے ہیں اور زمین پر اُتر آتے ہیں، اور خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے اور دنیا کے کام جو ان سے متعلق ہیں کرتے پھرتے ہیں۔ اور حیوانات کے جسم اور ان کے جسم میں اتنا ہی فرق ہے کہ ان کا جسم محسوس نہیں ہوتا، نہ چھونے سے ہاتھ کو لگتا ہے، نہ دیکھنے سے آنکھ کو دکھائی دیتا ہے، اور باوجود اس قدر نازک ہونے کے وہ بہت بڑے بڑے اور نہایت مشکل کام کرتے ہیں، پہاڑ اُٹھا لیتے ہیں۔ ہمارے پاس کسی ایسی مخلوق کے ہونے سے جو کسی قسم کا جسم و صورت بھی رکھتی ہو جو ہم کو نہ دکھائی دیتی ہو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، پس ہم کہتے ہیں کہ شاید ایسی مخلوق ہو، مگر ہم ایسی مخلوق کے ہونے کا دعوی بھی نہیں کرتے، اور جو افعال ایسی مخلوق کی نسبت منسوب کیے جاتے ہیں ان کا بھی اقرار نہیں کرتے کیونکہ ان باتوں کے اثبات کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، قرآن مجید سے فرشتوں کے اس قسم کے وجود کا، اور ان کے اس قسم کے جسم کا، اور ان کے ان افعال کا، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کچھ ثبوت نہیں ہے۔[۴۲]

سوم۔ نسخ کا انکار

آپ نے قرآن میں ناسخ اور منسوخ کا انکار کیا ہے۔

"۔۔۔ ہم ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے، اور یقین جانتے ہیں جو کچھ خدا کی طرف سے اُترا وہ بے کم و کاست موجودہ قرآن جو درحقیقت آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں تحریر ہو چکا تھا موجود ہے، اور کوئی حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے، اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے۔۔۔"[۴۳] مذکورہ عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ نے قرآن میں نسخ کا صاف انکار کیا ہے۔ حالانکہ اس بارے میں صریح آیت ہے جس میں نسخ کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

قَدِيْرٌ (۴۴) (ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟)

اس آیت کے بارے میں جمہور علماء مسلمین کا اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں نسخ موجود ہے۔ اکثر مفسرین اس آیت سے نسخ کو ثابت کرتے ہیں۔ ان مفسرین میں سے بعض کی آراء درج ذیل ہیں:

الف۔ یہ ایک خاص شبہہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے، تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمہارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اس تعلیم کے ایک حصّے کو بھول گئے جو انہیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں، بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے مِن جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسُوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں، حافظوں سے محو کر دوں۔ مگر جس چیز کو میں منسُوخ کرتا ہوں، اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں، یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔[۴۵]

ب۔ یہود کا یہ اعتقاد تھا کہ تورات کے احکام قیامت تک کبھی منسوخ نہیں ہوں گے۔ اسی اعتقاد کی وجہ سے انہوں نے انجیل کا کتاب الٰہی ہونا تسلیم نہیں کیا کیونکہ اس سے ان کو تورات کے بعض احکام کا منسوخ ہو جانا تسلیم کرنا پڑتا تھا اب جبکہ قرآن شریف کی بعض آیتیں بعض آیتوں سے منسوخ ہوئیں تو یہود لوگ مسلمانوں سے طرح طرح کی حجتیں اس بارے میں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کلام الٰہی کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں اور فرمایا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے سو کرے۔ اپنے بندوں کے حالات کی مصلحت سے جو احکام اس کو مناسب معلوم ہوئے اس نے سب سے پہلے صاحب شریعت نبی حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک وہ احکام نازل فرمائے اور پھر مصلحت وقت کے موافق ان احکام میں ترمیم کر کے تورات نازل فرمائی۔ اگر یہود کا یہ اعتقاد صحیح ہوتا کہ کلام الٰہی کبھی منسوخ نہیں ہوتا تو پچھلی شریعتوں کے احکام منسوخ ہو کر تورات کیوں کر نازل ہوتی۔ غرض یہود کا یہ اعتقاد ان کا گھڑا ہوا ایک اعتقاد ہے کسی حکم الٰہی کے موافق نہیں ہے اسی غلط اعتقاد نے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان بدنصیبوں کو انجیل پر عمل نہیں کرنے دیا اور یہی غلط اعتقاد قرآن پر عمل کرنے سے ان کو روک رہا ہے یہ کام بندوں کا نہیں ہے کہ اللہ کی ہر وقت کی مصلحت میں دخل دیویں کیونکہ بندوں کو ہر وقت کی

مصلحت کا علم نہیں ہے۔ پھر نامعلوم بات میں کوئی کیا دخل دے سکتا اور اگر دخل دیا بھی تو وہ صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ بے جا دخل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے جو ان لوگوں کا ہوا کہ دو شریعتوں سے منکر ہو گئے اور طرح طرح کے عذاب میں اس انکار کے سبب سے پھنس گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی تبدیل امر دینی میں ہو جاوے تو اس کو ناسخ و منسوخ کہتے ہیں جو پہلے کا حکم دوسری جدید حکم سے بدل جاوے ان میں پہلے حکم کو منسوخ اور جدید دوسرے حکم کو ناسخ کہا جاتا ہے مثلاً { اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللهِ}[۴۶] منسوخ ہے اور {لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا}[۴۷] اس کا ناسخ ہے۔[۴۸]

مذکورہ تفاسیر سے واضح ہوتا ہے کہ نسخ کا وجود قرآن پاک میں موجود ہے۔ مگر سرسید نے اس کا انکار کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ چیز سلبی نکات میں شمار ہو گی۔

چہارم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق سرسید احمد خان کا موقف

تفسیر انجیل لوقا میں لکھا ہے کہ "یہ عام یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یوسف کے بیٹے ہیں اور ان کا معجزہ کے طور سے پیدا ہونا مشہور نہیں کیا گیا تھا۔ اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ مریم علیہا السلام کا خطبہ یوسف سے ہوا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے"۔[۴۹] مذکورہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق سرسید کا موقف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد موجود تھے اور وہ بغیر والد کے پیدا نہیں ہوئے۔ حالانکہ یہ رائے جمہور مفسرین کے برعکس ہے۔ ان میں سے بعض مفسرین کا موقف درج ذیل ہے:

الف۔۔۔اور دیکھ تو حاملہ ہو گئی اور بیٹا جنے گی، اس کا نام یسوع ہو گا، وہ بزرگ ہو گا۔ مریم علیہا السلام نے فرشتہ سے کہا۔ کیونکر ہو گا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہو گا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی"۔ (لوقا:۲۸'۳۴)۔۔۔رفع استبعاد کے لیے حضرت مریم علیہا السلام کو یہاں یاد دلایا جا رہا ہے کہ نظر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہیے کہ وہی فاعل حقیقی ہے نہ کہ اسباب طبعی و ظاہری پر کہ ان کی حیثیت محض واسطہ اور ذریعہ کہ ہے۔ (آیت) کذلک"۔ یعنی مس بشر کے بغیر ہی (آیت)۔[۵۰]

ب۔ حضرت مریم علیہا السلام چونکہ ابھی کنواری تھیں۔ اور نہایت ہی عفیفہ اور پاکدامن تھیں۔ اس لیے یہ خوشخبری سن کر تعجب اور حیرت سے بولیں کہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ میرے ہاں بیٹا کس طرح پیدا ہو گا۔۔۔اس پر فرشتے نے کہا کہ تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ظاہری اسباب کے بغیر جو چاہتا ہے پیدا

کرلیتا ہے۔ اس کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کام کے مکمل ہو جانے کے لیے صرف اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے۔[۵۱]

ج۔ یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچہ پیدا ہو گا۔ یہی لفظ کَذٰلِکَ (ایسا ہی ہو گا) حضرت زکریا علیہ السلام کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریم علیہا السلام کے ہاں اسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جارہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادت مسیح علیہ السلام کے باب میں قرآن کے دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسب معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہار مافی الضمیر اور بیان مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں (معاذ اللہ)۔[۵۲] مذکورہ عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کا عقیدہ مسلمانوں کے ہاں ایک مسلمہ امر ہے، کہ عیسی علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ مگر سرسید احمد خان نے قرآن پاک کے الفاظ پر غور کرنے کے بجائے اپنی فکر سے وہ چیز بتاتے ہیں جس کی بنیاد کتب مقدسہ سے استدلال کی گئی ہے۔ حالانکہ عبد الماجد دریا آبادی نے بھی اپنی تفسیر میں کتب مقدسہ سے ہی استدلال کرکے حضرت عیسی کی علیہ السلام پیدایش کو بغیر باپ کے ثابت کیا ہے۔ (دیکھیے: تفسیر ماجدی) جب کتب مقدسہ سے مختلف آراء موجود ہیں تو ایک رائے پر یقین کیسے کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا سرسید کی رائے تمام جمہور علماء مسلمین کے خلاف پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کے اس موقف کو سلبی نکات میں شمار کیا جائے گا۔ ہم نے سرسید کی بعض آراء کو پیش کیا ہے جو کہ جمہور علماء مسلمین کے خلاف ہیں۔ مگر ان مذکورہ امور کے علاوہ اور بھی بہت ہیں جن کا تذکرہ کرنا طوالت کی وجہ سے گریز کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان چند آراء سے سرسید کی تفسیر کا منہج کسی حد تک واضح ہو سکتا ہے۔ سرسید نے جن مسائل میں علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ان امور میں سے اہم کا تذکرہ اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے:

۱۔ نصاری کا ذبیحہ (طیور منخنقہ) خواہ گلا گھونٹ کر مر گیا ہو۔ مسلمانوں کے لیے اس کا کھانا جائز ہے۔[۵۳]

۲۔ تورات اور انجیل میں تحریف لفظی نہیں، معنوی ہوئی ہے۔اس طرح ان کا الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے۔(۵۴)

۳۔ اخبار احاد کی بناء پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اسلام ان سے بری ہے۔(۵۵)

۴۔ جو کفار ومشرکین مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہوں ان کے علاوہ دوسرے کفار ومشرکین سے موالات جائز ہے۔(۵۶)

۵۔ وہ مسائل جن میں قرآن وحدیث کی کوئی نص موجود نہیں،ان میں ہر انسان کو اپنے لیے اجتہاد کا حق حاصل ہے۔(۵۷)

۶۔ وضع قطع اور لباس میں کفار کے مشابہ ہونا شریعت کے لحاظ سے ممنوع نہیں۔(۵۸)

۷۔ جبر وقدر پر آیات سے استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ یہ مقصد شارع کے خلاف ہے۔اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے استدلال پر غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔(۵۹)

۸۔ قرآن میں وارد آدم علیہ السلام، ملائکہ اور ابلیس کا قصہ خبر واقع نہیں، بلکہ تمثیل ہے۔(۶۰)

۹۔ معجزہ دلیل نبوت نہیں۔(۶۱)

۱۰۔ قرآن میں نبی اکرم ﷺ کے کسی معجزہ کا تذکرہ نہیں۔(۶۲)

۱۱۔ آیت میراث سے آیت وصیت منسوخ نہیں ہوئی۔بلکہ وارث کے حق میں وصیت جائز اور نافذ ہے۔(۶۳)

۱۲۔ جو لوگ روزہ مشکل سے رکھتے ہوں ان کو فدیہ دے دینا جائز ہے، خواہ وہ ضعیف العمر ہوں یا جوان، البتہ فدیہ دینے سے روزہ رکھنا افضل ہے۔(۶۴)

۱۳۔ آیت ربا میں صرف زمانہ جاہلیت کے ربا کی حرمت بیان ہوئی ہے اور وہ حرمت پیشہ ور سود خوروں کی ہے۔ تجارتی سود اس حرمت میں نہیں آتا۔(۶۵)

۱۴۔ شہداء کے زندہ ہونے سے مراد حقیقی زندگی نہیں بلکہ علو درجات، روحانی خوشی اور دنیا کے لیے قابل تقلید مثال ہے۔(۶۶)

۱۵۔ رویت باری تعالیٰ کسی طرح بھی ممکن نہیں نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔(۶۷)

۱۶۔ کوئی بھی امر، عادت الٰہی یا قانون طبعی کے خلاف واقعہ نہیں ہوتا۔(۶۸)

۱۷۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر اس حد کو نہیں پہنچی تھی کہ جس میں اولاد کا پیدا ہونا ناممکن ہو جائے۔(۶۹)

۱۸۔ قرآن میں وارد وَنُفِخَ فِي الصُّورِ(۷۰)۔(اور صور پھونکا جائے گا۔)

حقیقت میں نہیں بلکہ استعارہ استعمال ہوا۔ جس طرح بگل کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح اللہ کی مشیت وارادہ سے بعثت وحشر ہو گا۔ (۷۱)

۱۹۔ خدا کی ذات وصفات کے متعلق قرآن یا حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے اسے حقیقت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ وہ سب مجاز و استعارہ اور تمثیل ہیں۔ (۷۲) اسی طرح جملہ احوال آخرت بعث، حشر و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت دوزخ سب مجاز ہیں، حقیقت نہیں۔ (۷۳)

۲۰۔ قرآن میں جو زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اس سے کسی واقعہ کی خبر دینا مقصود نہیں بلکہ صرف یہود کے اس اعتراض کی تردید ہے کہ خدا نے ساتویں دن آرام کیا۔ اسی لیے چھ دنوں کا تذکرہ کرکے ساتھ یہ فرمایا کہ وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُغُوبٍ (۷۴) کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیاء پر بحث کرنا نہیں بلکہ خدا کی توحید وعظمت کے خلاف جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، انہیں رد کرنا ہے۔ (۷۵)

۲۱۔ ملکہ نبوت نے جو روح الامین سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضرت ﷺ کے قلب پر القا کیا ہے۔ (۷۶)

۲۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ در حقیقت ان کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ (۷۷)

۲۳۔ حضرت یونس علیہ السلام کے قصے میں اس بات پر قرآن مجید میں کوئی نص صریح نہیں ہے کہ در حقیقت مچھلی ان کو نگل گئی تھی۔ (۷۸)

۲۴۔ کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۷۹) ان لوگوں کو حقیقت میں بندر نہیں بنایا گیا۔ (۸۰)

تفسیر سر سید میں بعض تصد رج ذیل ہیں:

۱۔ حوالہ کا عدم اہتمام

تفسیر القرآن میں اہل کتاب سے متعلق آیات میں مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ مولف نے بعض مقامات پر حوالہ کا اہتمام نہیں کیا اور عدم توجہ کا مظاہرہ کیا ہے۔

الف۔ جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف تھے ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت وطہارت پر گواہی دی، اور اس بات کو کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ ہیں

جھٹلادیا، اور بتلادیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ مذکورہ عبارت میں سر سید نے اپنی تفسیر میں دو فرقوں کے احوال کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر آپ نے کسی تاریخی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

ب۔ اگر اس وقت عیسائیوں سے پوچھو تو سب عیسائی اس بات سے کہ وہ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی خدا سمجھتے تھے انکار کریں گے حالانکہ چوتھی صدی کے اخیر میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا۔۔۔ ان لوگوں نے (باپ اور بیٹے) یعنی خدا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے سوا حضرت مریم علیہا السلام کو بھی خدا مانا تھا یہ فرقہ چند روز رہا اور مدت سے معدوم ہو گیا۔ اسی طرح یہودیوں کا بھی ایک خاص فرقہ تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اب وہ معدوم ہے۔ مذکورہ عبارت میں سر سید نے اپنی تفسیر میں عیسائیوں کے ایک فرقہ کا احوال بیان کیا ہے۔ مگر آپ نے کسی تاریخی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ اس لیے حوالہ کے اہتمام میں کمی کی وجہ سے یہ چیز سلبی نکات میں شمار ہو گی۔

۲۔ نبی کے لیے نامناسب الفاظ کا استعمال

تفسیر القرآن میں اہل کتاب سے متعلق آیات میں دیکھا گیا ہے کہ مولف نے نبی کے لیے نامناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

جیسے: اس مقام پر قابل غور یہ بحث ہے کہ بچھڑا بنانے والا کون تھا توریت میں لکھا ہے کہ خود حضرت ہارون علیہ السلام بچھڑا بنانے والے تھے اور خود انہوں نے ہی بچھڑے کی پرستش کروائی۔ مگر جب ہم خود توریت کے مضامین پر خیال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہارون علیہ السلام کو بھی برکت دی تھی اور تمام احکام جو خدا نے موسی علیہ السلام کو دیے تھے ان کی حضرت ہارون علیہ السلام ہی تعمیل کرتے تھے۔ بلکہ حضرت موسی علیہ السلام تو صرف نام ہی کے تھے خدا کے تمام احکام بذریعہ حضرت ہارون علیہ السلام پورے ہوتے تھے تو ہم اس بات کو کہ حضرت ہارون علیہ السلام اس بچھڑے کے بنانے والے اور بت پرستی کی اجازت دینے والے تھے۔ جیسا کہ توریت میں لکھا ہے صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ (۸۱) مذکورہ عبارت میں سر سید نے اپنی تفسیر میں حضرت موسی علیہ السلام کے لیے فرماتے ہیں کہ وہ صرف نام کے نبی تھے۔ حالانکہ قرآن میں واضح طور پر حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا (۸۲) اور انہی کو تورات دینا ثابت ہے۔ (۸۳) اور شروع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کو ہی نبی بنایا تھا۔ (۸۴) پھر بعد میں حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے بھائی ھارون علیہ السلام کو نبی بنانے کی مہربانی کی جائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا کو قبول کیا۔ اور حضرت ھارون علیہ السلام کو بھی نبی بنایا۔ (۸۵) اب یہ کیسے تصور کیا جائے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہو، وہ صرف نام کے نبی بن کر رہ جائیں! اس

لیے یہ چیز ہم سلبی نکات میں شمار کریں گے۔کیونکہ سرسید نے حضرت موسی علیہ السلام کے لیے الفاظ نامناسب استعمال کیے ہیں، کہ وہ صرف نام کے نبی تھے۔حالانکہ اللہ تعالی کے لیے وہ کام کے نبی تھے۔

۳۔تمام مفسرین پر تنقید

تفسیر القرآن میں اہل کتاب سے متعلق آیات میں دیکھا گیاہے کہ مولف نے بعض مقامات پر تمام مفسرین پر تنقید کی ہے۔حالانکہ ان مفسرین نے دن رات محنت کے ساتھ کلام اللہ کی تفسیر میں اپنی صلاحیت کو استعمال کیا۔ انہوں نے مختلف مسائل اور معاملات میں ملت اسلامیہ کو قرآن پاک کے ذریعے رہنمائی عطا کی اور کافی حد تک وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔اس وجہ سے قرآن پاک کی تفسیر کا عظیم ورثہ ملت اسلامیہ کے پاس محفوظ کر دیا گیا ہے۔لیکن سرسید احمد خان نے تمام مفسرین کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

الف:۔۔۔توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح سے لکھا ہے کہ "بادل تمام دن بنی اسرائیل کو راہ دکھانے کے لیے ان کے آگے آگے چلتا تھا، اور جہاں ٹھیر تا جاتا تھا، وہاں بنی اسرائیل مقام کرتے تھے، اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا۔مگر اس پر کیونکر یقین ہو سکتا ہے جب کہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہنچنے کا رستہ نہیں ملا۔ہمارے علمائے مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ایسی باتیں کی ہیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے"۔[۸۶] مذکورہ عبارت میں سرسید احمد خان نے تمام مفسرین کو مورد الزام ٹھیراتے ہیں، کہ انہوں نے اس اسرائیلی روایت کو لیا ہے۔حالانکہ اس طرح کی اسرائیلی روایات پر اکثر مفسرین نے تعاقب کیا ہے۔اور ایسے مفسرین کی تعداد بہت ہی کم ہے جنہوں نے ان روایات کو قبول کیا ہے۔مگر مولف نے تمام مفسرین پر الزام لگایا ہے۔

ب: مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ[۸۷] کو عجیب و غریب واقعہ بنادیا ہے، اور ہمارے مسلمان مفسر عجائبات دوراز کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں۔[۸۸] سرسید احمد خان نے مذکورہ عبارت میں مفسرین کے لیے انتہائی سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔حالانکہ احسن طریقہ سے علمی مسائل میں اختلاف کیا جاسکتا ہے۔مگر آپ نے مفسرین کا احترام ملحوظ نہیں رکھا، لغو اور بیہودہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔جو کہ ایک عالم کے لیے زیب نہیں دیتے۔اگرچہ بعض مفسرین نے اسرائیلی روایات کا تذکرہ کیا ہے۔مگر ایسے مفسرین کے تعداد قلیل ہے۔اور دیگر مفسرین نے اسرائیلی روایات پر تعاقب کیا ہے۔لہٰذا تمام مفسرین پر اس طرح کے الزام عائد کرنے کو سلبی نکات میں شمار کیا جائے گا۔

۴۔اسرائیلی روایات پر عدم تعاقب

تفسیر القرآن میں اہل کتاب سے متعلق آیات میں بعض مقامات پر مولف نے اسرائیلی روایات پر عدم تعاقب کا مظاہرہ کیا ہے۔ جیسے: حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ایک ابتر حالت میں ہو گیا تھا۔ کافروں کو موافق اپنے مذہب اور عقائد کے پوجا پاٹ اور بت پرستی کرنے کی کچھ ممانعت نہ تھی، خود حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہایت کثرت سے بیویاں کر لی تھیں، اور بت پرست عورتوں کو بھی اپنی بیویاں بنایا تھا۔ عمونی قوم کی اور موابی قوم کی اور صدوقی قوم کی بیویاں ان کے گھر میں تھیں، اور وہ اپنے محلوں میں بت پرستی کرتی تھیں، اور اس سب سے گویا شاہی محل میں بت پرستی ہونے لگی تھی۔[۸۹] مذکورہ عبارت میں سرسید احمد خان نے اسرائیلی روایت کو من وعن قبول کیا ہے۔ اس عبارت میں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی پر اہل کتاب نے الزام دھرا ہے کہ وہ اپنے محل میں بت پرستی کو برداشت کرتے تھے۔ حالانکہ اس اسرائیلی روایت پر مفسرین نے بھی تعاقب کیا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا سخت مخالف رہا ہے، ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرور حکومت، غرور عقل ودانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک وبت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔[۹۰]

نتائج بحث

اہل کتاب سے متعلق تفسیر القرآن کے محاسن اور نقائص کا تحقیقی مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

سرسید احمد خان بنیادی طور پر ایک ادیب اور عبقری شخصیت کے حامل تھے۔ اس لیے آپ نے اپنی تفسیر میں استنباط کے ذریعے اہم نکات ذکر کیے ہیں۔ آپ نے فاسد عقائد اور نظریات کے پیدا ہونے کے اسباب اور وجوہات پر بھی گفتگو کی ہے۔ تاکہ ان موجودہ فاسد نظریات سے اہل کتاب رجوع کریں اور دین اسلام کو قبول کریں۔ آپ چونکہ کتب مقدسہ کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اس لیے آپ نے اپنی تفسیر میں کافی مقامات پر اہل کتاب کی کتب مقدسہ میں عقلی اور نقلی استدلال کے ذریعے تحریف کو ظاہر کیا ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنی تفسیر میں مستشرقین کے شبہات اور اعتراضات پر مدلل بحث کرتے ہوئے حق کو ثابت کیا ہے۔ آپنے اپنی تفسیر میں لغوی اور فروعی مباحث سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے تفسیر میں قرآن پاک کے ہدایت والے پہلو کی طرف توجہ مرکوز کی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ قرآن پاک سے عملی زندگی سے وابستہ مسائل میں رہنمائی حاصل کی جائے۔

مراجع وحواشی

۱۔ سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ج ا۔ قاسم شہزاد پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰ء۔ ص ۱۷۶'۱۷۷ ۲۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۳۰۰
۳۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۰۹۔۲۱۶ ۴۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۶۶ ۵۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۸۔۱۰
۶۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۱۴'۱۱۵ ۷۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۸۷۔۲۸۹ ۸۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۶۴۹'۶۵۰
۹۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۶۴۸ ۱۰۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۴۴
۱۱۔ امام الترمذی، سنن الترمذی، باب ۴۹، رقم الحدیث، ۲۴۹۹، ج ۴، ص ۲۴۰، مصر، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی (الطبعہ الثانیہ) ۱۳۹۵ھ۔۱۹۷۵م)
۱۲۔ محمد ارشد، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، برصغیر کے تفسیری ادب پر سر سید احمد خان کے تفسیری افکار کے اثرات کا تحقیقی جائزہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔ ص ۹۰
۱۳۔ الزرقانی، محمد عبد العظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن، ج ا، بیروت، دار الکتب العلمیہ (طبع اول) ۲۰۰۳ء۔۱۴۲۴ھ۔ ص ۴۷۳۔۴۷۷
۱۴۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۷ ۱۵۔ محمد ارشد، ص ۱۷
۱۶۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، ج ا، لاہور، میاں چیمبرز ۳ ٹمپلروڈ، ۲۰۰۷ء۔ ص ۲۷۰ ۱۷۔ محمد ارشد، ص ۶۳'۶۴
۱۸۔ حالی، ج ا، ص ۲۷۳ ۱۹۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۳ ۲۰۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۰
۲۱۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۳ ۲۲۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۲۰ ۲۳۔ محمد ارشد، ص ۱۰۶
۲۴۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۱۸'۱۱۹ ۲۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲، ص ۱۱۹، (طبع اول) لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۳۸۶ھ۔۱۹۶۶
۲۶۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۱۸'۱۱۹
۲۷۔ القرآن، ۲۹:۴۶۔ امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب: قول النبی لا تسالوا اہل الکتاب عن شیء، رقم الحدیث: ۷۳۲۲، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۲ھ
۲۸۔ امام ذہبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، ج ا، ص ۱۱۴۔۱۱۹۔ مزید دیکھیے: جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲ ص ۴۹۸'۴۹۹، القاہرہ، دار الفجر للتراث، ۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
۲۹۔ قرآن پاک کی تفسیر کرنے میں اہم مصادر یہ ہیں: ا۔ قرآن پاک کی تفسیر خود قرآن پاک سے کی جائے۔ ۲۔ قرآن پاک کی تفسیر اگر قرآن میں نہ ملے تو احادیث کے ذریعے کی جائے۔ ۳۔ اگر قرآن پاک کی تفسیر قرآن میں نہ ملے اور احادیث میں بھی نہ ملے تو اقوال صحابہ کے ذریعے کی جائے۔ ۴۔ اگر قرآن پاک کی تفسیر قرآن، احادیث، اور اقوال صحابہ سے بھی نہ ملے تو اقوال تابعین کے ذریعے کی جائے۔ ۵۔ اگر قرآن پاک کی تفسیر قرآن، احادیث، اقوال صحابہ، اور اقوال تابعین سے بھی نہ ملے تو عربی لغت کے ذریعے کی جائے۔ دیکھیے: خالد عبد الرحمن العلک، اصول التفسیر وقواعدہ، ص ۷۹'۸۰، دمشق، دار النفائس
۳۰۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات قرآنی، ص ۱۵۶، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی اسٹریٹ اردو بازار، ۲۰۰۹ء
۳۱۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۸ ۳۲۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۸۸۔۹۱ ۳۳۔ سر سید احمد خان۔ ج ا، ص ۱۱۸'۱۱۹
۳۴۔ امام الرازی: (۵۴۴۔۶۰۶ھ۔۱۱۵۰۔۱۲۱۰ع) آپ کا نام محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین التیمی البکری، ابو عبد اللہ فخر الدین الرازی تھا۔ آپ تفسیر کے فن میں امام تھے۔ آپ قدیم زمانے کے علوم اور معقول ومنقول میں مہارت کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ اصل میں طبرستان سے تھے، اور وفات ہراۃ میں پائی۔ آپ کی کتابیں آپ کے دور ہی میں لوگ پڑھنے اور پڑھانے لگے تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے بعض یہ ہیں: مفاتیح الغیب۔ ۸ مجلدات میں قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ ولوامع البینات فی شرح اسماء اللہ تعالی والصفات۔ معالم اصول الدین۔ آپ ایک اچھے خطیب بھی تھے۔ دیکھیے: الزرکلی، خیر الدین، الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ج ۶، بیروت، دار العلم للملایین مؤسسۃ ثقافیۃ، ۲۰۰۵ء۔ ص ۳۱۳
۳۵۔ الرازی، امام فخر الدین، تفسیر الکبیر، ج ۳، ص ۵۰۸، دار الفکر
۳۶۔ قرطبی: آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری، قرطبی تھا۔ آپ کتاب التذکرہ بامور الآخرۃ اور تفسیر جامع الاحکام القرآن کے مصنف تھے۔ آپ اپنے زمانے میں ایک امام کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کو علوم اسلامیہ میں کافی حد تک رسوخ حاصل تھا۔ آپ کی وفات ۶۷۱ھ میں ہوئی۔ دیکھیے: جلال الدین سیوطی، طبقات المفسرین، ص ۹۲، مصر، مکتبہ وھبہ قاہرہ، ۱۳۹۶ھ

۳۷۔ امام قرطبی، شمس الدین، الجامع لأحکام القرآن، ج۱، ص۳۹۰، القاہرہ، دار الکتب المصریہ، (طبع دوم) ۱۳۸۴ھ۔۱۹۶۴ء

۳۸۔ ابن کثیر: (۷۰۱ھ۔۷۷۴ھ۔۱۳۰۲۔۱۳۷۳ء) آپ کا نام اسماعیل بن عمر بن کثیر بن صنو بن درع قریشی، بصروی، دمشقی، ابو الفداء ہے۔ آپ حدیث کے فن میں حافظ کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ مؤرخ، اور فقیہ کی حیثیت سے اپنے زمانے میں معروف تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے بعض یہ ہیں: البدایہ والنھایہ ط، شرح صحیح البخاری جو کہ مکمل نہ ہوئی۔، طبقات الفقہاء الشافعین، اور تفسیر القرآن الکریم، ۱۰ اجزاء میں۔ دیکھیے: الزرکلی، ج۱، ص۳۲۰

۳۹۔ امام ابن کثیر، إسماعیل بن عمر، تفسیر ابن کثیر، ج۱، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، منشورات محمد علی بیضون، ۱۴۱۹ھ۔ ص۲۶۰

۴۰۔ شوکانی: آپ کا نام محمد بن علی بن محمد شوکانی، خولانی، صنعانی تھا۔ آپ کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ آپ کو بہت سے علوم میں رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ ایک مفسر، محدث، فقیہ، اُصولی، مؤرخ، ادیب، نحوی، منطقی، اور متکلم تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے بعض یہ ہیں: "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع" اور "فتح القدیر الجامع بین فنی الروایہ والدرایہ من علم التفسیر، آپ کی وفات ۱۲۵۰ ہجری میں ہوئی۔ دیکھیے: عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین تراجم مصنفی الکتب العربیہ، ج۱۱، ص۵۳، بیروت، دار احیاء التراث العربی

۴۱۔ امام الشوکانی، محمد بن علي بن محمد بن عبد اللہ، تفسیر فتح القدیر، ج۱، ص۳۹۰، بیروت، دار ابن کثیر، دار الکلم الطیب، (طبع اول) ۱۴۱۴ھ

۴۲۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۴۲۔۴۵ ۴۳۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۴۱۔۱۴۴ ۴۴۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۶۳'۱۶۴

۴۵۔ القرآن، ۱۰۶:۲

۴۶۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج۲' ۱۰۱'۱۰۲۔ لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، غزنی سٹریٹ رحمان مارکیٹ، اردو بازار، ۲۰۰۶ء

۴۷۔ القرآن، ۲۸۴:۲ ۴۸۔ القرآن، ۲۸۶:۲

۴۹۔ حافظ محمد سید احمد حسن، تفسیر احسن التفاسیر، المکتبہ السلفیہ شیش محل روڈ۔ لاہور ص۵۱'۵۲ ۵۰۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۲۹۰۔۳۰۱

۵۱۔ عبد الماجد دریا آبادی، تفسیر ماجدی، کراچی، مجلس نشریات قرآن۔ ص۱۳۳

۵۲۔ مولانا غلام اللہ خان، تفسیر جواہر القرآن، ج۱، راولپنڈی، کتب خانہ رشیدیہ۔ ص۳۴۲ ۵۳۔ مودودی، ج۱، ص۲۵۱'۲۵۲

۵۴۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۳۸۹۔۳۹۶ ۵۵۔ مقالات سر سید، ج۱، ص۲۹۶، لاہور، زرین آرٹ پریس، ۱۹۶۲ء

۵۶۔ مقالات سر سید، ج۱، ص۱۴۔۵۹ ۵۷۔ سر سید احمد خان۔ ج۲، ص۱۰۸ ۵۸۔ مقالات سر سید، ج۱، ص۲۹۶

۵۹۔ مقالات سر سید، ج۱، ص۱۔۹۴ ۶۰۔ مقالات سر سید، ج۱، ص۲۴۵۔۲۵۳ ۶۱۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۷۳۔۸۵

۶۲۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۴۷۲ ۶۳۔ القرآن، ۱۴۶:۲ ۶۴۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۹۸۔۲۰۲

۶۵۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۲۰۲۔۲۱۴ ۶۶۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۲۶۳۔۲۷۲ ۶۷۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۳۴۰۔۳۴۳

۶۸۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۳۷۹'۳۸۰ ۶۹۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۵۔۱۷ ۷۰۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۷۸۔۱۸۷

۷۱۔ القرآن، ۱۸:۹۹ ۷۲۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۴۸۶۔۴۹۰ ۷۳۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۰'۱۱

۷۴۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۵۶۔۵۷ ۷۵۔ القرآن، ۳۸:۵۰ ۷۶۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۵۶۸۔۵۷۰

۷۷۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۔۹ ۷۸۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۔۲۳ ۷۹۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۔۲۳

۸۰۔ القرآن، ۶۵:۲۔ (ترجمہ: بندر بن جاؤ اور اس حالت میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔)

۸۱۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۱۲۵'۱۲۶ ۸۲۔ سر سید احمد خان۔ ج۱، ص۶۴۸

۸۳۔ **وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا** (ترجمہ: اور اللہ تعالی نے موسی کے ساتھ کلام کیا۔) (القرآن، ۱۶۴:۴)

۸۴۔ **وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ** (ترجمہ: اور جب ہم نے موسی کو کتاب فرقان دی تاکہ تم ھدایت یافتہ بن جاؤ) (القرآن، ۵۳:۲)

۸۵۔ **وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَى قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَى () قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَى فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى** (ترجمہ: اور اے موسیٰ (علیہ السلام) یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟۔ بولا، یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور اپنی بکریوں پر اس سے پتے جھاڑا کرتا ہوں اور مجھے اس میں اور بھی فائدے ہیں۔ فرمایا اے موسیٰ (علیہ السلام) اسے پھینک دے۔ اس نے پھینک دیا وہ فوراً دوڑتا سانپ بن گیا، (القرآن، ۱۷:۲۰۔۲۰)

۸۶۔ واجْعَلْ لِي وزِيرًا مِنْ أَهلِي () هارُونَ أَخِي () اشْدُدْ بِه أَزْرِي () وأَشْرِكْه فِي أَمْرِي () كَيْ نُسبِّحك كَثِيرًا () ونَذْكُرك كَثِيرًا () (ترجمہ: اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے۔ ہارون، جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کردے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ (القرآن، ۲۰:۲۹۔۳۴)

۸۷۔ سرسید احمد خان۔ ج۱، ص۱۱۸،۱۱۹

۸۸۔ الف، مذکورہ بالا واقعہ جس کی طرف سرسید احمد خان نے اشارہ کیا ہے، وہ درج ذیل ایک سورہ میں بیان ہوا ہے:

وإذْ نَتَقْنَا الْجبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّه ظُلَّةٌ وظَنُّوا أَنَّه واقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ واذْكُرُوا مَا فِيه لَعلَّكُمْ تَتَّقُونَ (القرآن، ۷:۱۷۱) (ترجمہ: انہیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جبکہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آپڑے گا اور اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔) ب۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کی تفصیل ایک تفسیر کے ذریعے بھی بیان کی جاتی ہے۔ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو موسیٰ (علیہ السلام) کو شہادت نامہ کی سنگین لوحیں عطا کیے جانے کے موقع پر کوہ سینا کے دامن میں پیش آیا تھا۔ بائیبل میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا'' (خروج ۱۹: ۱۷۔۱۸) اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کتاب کی پابندی کا عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ان پر ایسا ماحول طاری کر دیا جس سے انہیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اس کے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہ کائنات کے ساتھ میثاق استوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں۔ اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انہیں زبردستی خوف زدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہل ایمان تھے اور دامن کوہ میں میثاق باندھنے ہی کے لیے گئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و اقرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے تاکہ اقرار کرتے وقت انہیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادر مطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بدعہدی کرنے کا انجام کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھیے: مودودی۔ ج۲ ص۹۵۔ مذکورہ عبارت میں آخر کون سی بے ہودہ اور لغویات ہے۔ جس کی طرف سرسید احمد خان نے اپنی تفسیر میں تمام مفسرین کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ آیت کی روشنی میں تفسیر کی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ قرآن پاک کے بیان کو کتب مقدسہ کے ذریعے تصدیق بھی کرا دی گئی ہے۔

۸۹۔ سرسید احمد خان۔ ج۱، ص۱۲۴ ۹۰۔ سرسید احمد خان۔ ج۱، ص۱۵۸ ۹۱۔ مودودی۔ ج۳، ص۵۸۱،۵۸۲